سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ چیزیں من اور سلویٰ کی طرح وہ محنت و مشقت کے بغیر مفت چاہتے تھے ۔

آیت میں "بقل" ہر قسم کی سبزی و ترکاری کو شامل ہے ۔ "قثاء" کھیرا اور ککڑی دونوں کو کہتے ہیں ۔ "فوم" اور ثوم "لہسن" کو کہتے ہیں ۔ گیہوں کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے "عدس" مسور کی دال کو کہتے ہیں ۔ صرف دال کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے ۔ سب کو جمع کر دیا گیا ہے کہ ان کے پیش نظر یہ سبھی چیزیں تھیں ۔ مصر سے مراد خاص شہر نہیں بلکہ کوئی بھی شہر مراد ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تم میں قیادت و سرداری کی صلاحیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا تھا ۔ اگر ذلت و پستی ہی تمہارا مقدر بن چکی ہے تو اس تربیت گاہ (سینا کے جنگل) سے نکل کر کسی بھی شہر میں چلے جاؤ ۔ وہاں محنت و مشقت کرو جیسے پہلے غلامی کی زندگی میں کرتے تھے ۔ یہ ساری چیزیں تمہیں مل جائیں گی ۔

کلہ آیت میں خاص طور سے ان قوموں کے لئے بڑی نصیحت ہے کہ جن کے سامنے بلند و برتر مقصد ہوتا ہے اور اس کی خاطر وہ قربانیوں اور مشقتوں کی بڑی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں ۔ وقتی فائدہ اور معمولی آرام کی زندگی کو وہ سب کچھ سمجھ لیتے ہیں ۔ حالانکہ ان کے مقصد کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کا ہے یہ چیزیں نہایت ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہیں ۔ قوموں کی زندگی میں وہ وقت نہایت کٹھن ہوتا ہے جب کہ صحت کی بحالی سے پہلے مریض کی بے جا اصرار سے تنگ آکر اس کے "کیس" کو خود اسی کے سپرد کر دیا جائے ۔ ابتدا میں اپنی مرضی و پسند کی کچھ چیزیں ملنے سے اسکو خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن نتیجہ میں فوری ہلاکت ہو جاتی یا بیماری طول پکڑ لیتی ہے اور کبھی ایسی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ مدتوں سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے ۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں ۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے ۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ۔

درسِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

(۸)

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب و تسوید: جمیل الرحمٰن / عاکف سعید

گزشتہ سے پیوستہ

گذشتہ نشست میں ہم اس سورہ مبارکہ کی چوتھی آیت کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس کا ایک حصہ ہی پڑھ پائے تھے کہ مقررہ وقت ختم ہو گیا اور بقیہ حصہ کا مطالعہ اگلی نشست کیلئے چھوڑنا پڑا۔ چوتھی آیت میں چونکہ نہایت اہم مباحث و موضوعات آئے ہیں اور اسی آیت کے ایک حصے کو بنیاد بناتے ہوئے منکرین حدیث و سنت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کا کوئی تصور اسلام میں موجود نہیں ہے، اور ان کی یہ رائے چونکہ کتاب و سنت، تعامل صحابہ اور اجماع امت کے بالکل خلاف ہے لہٰذا ان کے اس موقف کی تردید اور ان کے استدلال کو غلط ثابت کرنے کے لئے مجھے اس مسئلہ کی وضاحت میں قدرے تفصیل سے جانا پڑا۔

سورۂ محمدؐ کا زمانۂ نزول

اس سورہ مبارکہ کے بارے میں جو چند بنیادی باتیں میں عرض کر چکا ہوں، ان میں ایک اہم بات اس کے زمانہ نزول سے متعلق ہے، جس کے پس منظر میں اس سورت کے مضامین کو بہتر طریق پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے ان مفسرین کرام کی رائے سے اتفاق ہے کہ جن کا خیال ہے کہ یہ سورہ مبارکہ غزوۂ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے..... میرا گمان ہے کہ سیرتِ مطہرہؐ میں جو واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ جس میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یہ خبر دے کر مشورہ فرمایا تھا کہ ایک تو تجارتی قافلہ ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے شمال کی جانب واپس آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ معدودے چند محافظ ہیں اور مالِ تجارت

بہت ہے۔ گویا اس پر حملہ کیا جائے تو مال غنیمت بہت زیادہ ملے گا۔ مزاحمت یا مقاومت (RESISTANCE) نہ ہونے کے برابر ہوگی چونکہ اس قافلہ کے ساتھ تیس اور پچاس محافظوں کی نفری ہے۔ دوسرے حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جنوب یعنی مکہ کی جانب سے ایک لشکر کیل کانٹے سے لیس آ رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان دو میں سے ایک پر وہ ضرور ہمیں فتح عطا فرمائے گا۔ اب بتاؤ کہ کدھر چلنا چاہئے!

کچھ لوگوں کی طرف سے یہ بات آئی کہ قافلہ کی طرف چلنا چاہئے۔ اس کا ذکر سورۃ الانفال میں آیا ہے اور اسے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے، اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ غور و تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ کچھ اہم امور کے ضمن میں وہ چند لوگوں کی باتوں کو بھی اس طرح عمومی انداز میں بیان کرتا ہے کہ ایسا تأثر ملتا ہے کہ شاید عظیم اکثریت کی یہ رائے ہو ... حالانکہ اکثر صحابہ کرامؓ کی رائے وہی تھی جو حضورؐ کا رجحان تھا کہ لشکر کے مقابلے کے لئے چلا جائے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی جیسا کہ سورۃ الانفال میں تفصیل سے آیا ہے۔

مشاورت میں تقاریر

میں پچھلی مرتبہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس موقع پر مہاجرین میں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پرجوش تقاریر کیں اور عرض کیا کہ حضورؐ بسم اللہ کیجئے جو آپؐ کا ارادہ ہو ..... حضرت مقدادؓ نے تو اپنی تقریر میں یہ تاریخی الفاظ ادا کئے کہ "حضور! آپؐ ہمیں حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمایئے جنہوں نے کہا تھا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (کہ جاؤ تم اور تمہارا رب اور جنگ کرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔) ہم تو آپؐ کے چشم ابرو کے اشارے کو اپنے حق میں حکم کا درجہ سمجھتے ہیں، جو آپؐ کی مرضی ہو بسم اللہ کیجئے۔ کیا عجب! ہمارے ذریعہ سے آپؐ کو اللہ تعالیٰ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔" لیکن اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضورؐ کسی چیز کے منتظر ہیں تو پھر انصار میں سے خزرج کے سردار حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ تاریخی تقریر کی جو میں گذشتہ نشست میں آپ حضرات کو تفصیل سے سنا چکا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! ہم

نے آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کیا ہے‘ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں‘ اب ہمیں اپنے فیصلہ کا اختیار کہاں رہا! آپؐ کا روئے سخن اگر ہماری جانب ہے تو تردّد نہ فرمایئے جو فیصلہ بھی آپؐ فرمائیں گے وہ ہمیں بسروچشم قبول ہو گا‘..... حضرت سعدؓ کی تقریر سن کر حضورؐ کا چہرۂ انور خوشی سے کھل اٹھا اور قافلہ بدر کی طرف رواں دواں ہوا۔

میرے نزدیک اس سورۂ مبارکہ کے مضامین پر غور کرنے سے یہ داخلی شہادت بھی مل جاتی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ اس مشاورت کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ گویا ایک اعتبار سے فوری تمہید ہے غزوہ بدر کی جس کا موقع اب آنے ہی والا تھا۔ آیت نمبر ۴ کے ابتدائی الفاظ مبارکہ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جنگ کا مرحلہ بالفعل اب آنے ہی والا ہے..... اس سے پہلے اثنائے سفر ہجرت میں قتال کی اجازت آئی تھی‘ جو سورہ الحج میں مذکور ہے اور سورۃ البقرہ میں قتال کا حکم آ گیا تھا کہ "وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" اور "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ" یعنی اے نبیؐ اور اے نبیؐ پر ایمان لانے والو! اب تمہاری دعوت و تحریک اس مرحلہ تک پہنچ گئی ہے کہ اب تمہیں جان ہتھیلی پر رکھ کر مشرکین سے قتال کے لئے میدان میں آنا ہو گا۔ پھر اسی سورہ میں جو ہمارے زیر مطالعہ ہے آپ دیکھیں گے کہ قتال کی ترغیب مختلف اسالیب سے آ رہی ہے اور مسلمانوں کا حوصلہ بندھایا جا رہا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے‘ مشرکین کے اس لشکر کی معنوی حالت یہ ہو گی کہ ان پر تمہاری ہیبت و رعب طاری ہو گا اور تم ان کی گردنیں مار سکو گے فَضَرْبَ الرِّقَابِ کی تشریح میں یہ تمام باتیں میں آپ کے گوش گذار کر چکا ہوں۔ نیز اس بات کی شہادت سورۃ الانفال کی آیات سے بھی پیش کر چکا ہوں۔ میں اس رائے کو درست سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ سورہ مبارکہ غزوہ بدر کی تمہید کے طور پر نازل ہوئی ہے‘ اسی سبب سے اس سورہ کا دوسرا نام "سورۃ القتال" بھی ہے۔

حق و باطل کی ابدی کشمکش

میں عرض کر چکا ہوں کہ حق و باطل کی کشمکش و کشاکش ابد تک جاری رہے گی اس لئے کہ ابلیس لعین انسانوں کو اغواء کرنے اور بہکانے کی مہلت بارگاہ الٰہی سے قیامت تک کے لئے لے کر آیا ہے۔

ذرا سیرت پر ایک نگاہ ڈالیں! حضورؐ کی حیات طیبہ میں فتح خیبر، فتح مکہ اور پھر ہوازن و ثقیف کے قبائل کے اسلام قبول کرنے کے بعد جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین اللہ غالب ہو گیا۔ گویا لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کی شان کا ظہور ہو گیا، جنگوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سرزمین عرب کی حد تک حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا کی تکمیل ہو گئی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سلطنت روما سے ٹکراؤ شروع ہوا۔ ۸ھ میں غزوہ موتہ ہوا اور پھر ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر تبوک ہے جو دراصل سلطنت روم سے ٹکراؤ کی تمہید ہے۔ پھر نبی اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد ایک طرف سلطنت روما سے باضابطہ مسلح ٹکراؤ شروع ہوا تو دوسری طرف سلطنت ایران سے جنگوں کے سلسلہ کا آغاز ہو گیا۔ ...... حق و باطل کی یہ کشمکش و کشاکش ہے اس کے متعلق جان لیجئے کہ یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک فیصلہ کن طور پر اسلام کا عالمی غلبہ نہیں ہو جاتا۔ میں نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کا جو شعر آپ کو پہلے بھی سنایا ہے اور آج بھی سنا رہا ہوں، اس میں بڑی پیاری بات علامہ مرحوم نے کہی ہے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

یہ کشمکش حضرت آدمؑ کے ہبوط ارضی کے وقت سے اس دنیا میں مسلسل ہوتی چلی آ رہی ہے اور وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کبھی حق کو غلبہ عطا فرماتا تھا، پھر باطل کی قوتیں مجتمع ہوتی تھیں۔ حق پس منظر میں چلا جاتا تھا اور باطل کی حکمرانی ہوتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ حق کے غلبہ کے لئے کسی نبی رسول کو بھیجتا تھا اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضورؐ آخری نبی اور آخری رسول ہیں، آپؐ کی رسالت کا دور قیامِ قیامت تک کے لئے ہے۔ لہٰذا عالمی سطح پر اللہ کے دین کے غلبہ کا معاملہ درحقیقت بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ہے۔ جس وقت تک یہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک گویا حضورؐ کا مقصدِ بعثت آخری درجہ میں ابھی شرمندۂ تکمیل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وقتِ فرصت کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

تیسرے خلیفۂ راشد شہید مظلوم امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنّورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے ابتدائی آٹھ سالوں میں ایک طرف سلطنتِ کسریٰ ختم ہوئی، دوسری جانب سلطنتِ روما کے عمل دخل، اور اس کی حکومت کا مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں مصر سے لے کر مراکش تک خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح اسلامی حکومت کی حدود ماوراء النہر میں بخارا، تاشقند، سمرقند حتیٰ کہ مکران تک پہنچ گئیں۔ لیکن یہودی سازش کی وجہ سے خلافت عثمانی کے دور کے آخری ساڑھے چار سال باہمی اختلافات، بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی نذر ہوئے جس کے نتیجہ میں امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مظلومانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ پھر یہودی اور مجوسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قریباً ساڑھے چار سال کا دور خلافت باہمی خانہ جنگی میں گذرا اور ان جنگوں کے نتیجہ میں قریباً چوراسی ہزار مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے قتل ہوئے۔ اس وجہ سے اسلامی انقلاب کی توسیع کے حرکی عمل کا زور (MOMENTUM) ٹوٹ گیا اور وہ صورت ختم ہو گئی کہ ؏ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا..... بعد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں یہ تعطل ٹوٹا اور انقلاب اسلامی کی توسیع کا عمل پھر شروع ہوا لیکن اس میں جذبۂ جہاد کی وہ شان باقی نہ تھی جو خلافتِ راشدہ کا طغرۂ امتیاز تھی۔ پھر بنوامیہ اور بنوعباس کی باہمی آویزشوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بنوعباس کی کامیابی پر منتج ہوا۔ بنوعباس کی خلافت کا خاتمہ ہوا تو ترکان عثمانی کی حکومت کا دور شروع ہوا جو ۱۹۲۲ء میں اس طور پر ختم ہوا کہ نہ صرف سلطنت عثمانیہ پارہ پارہ ہوئی بلکہ پورے کرّۂ ارضی پر تمام مسلم مملکتیں کسی نہ کسی انداز سے یا تو مغربی استعمار کا براہ راست نوالہ بن کر ان کی غلام و محکوم ہو گئیں یا مغربی طاقتوں کے زیرِ انتداب آ گئیں۔

مسلم مملکتوں کا قیام

اس مکمل زوال و انحطاط اور مغلوبیت سے قبل بنوامیہ سے لے کر ترکانِ عثمانی تک کے دور میں متعدد مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، لیکن ان کو اسلامی انقلاب کی توسیع کا عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اسے مسلمانوں کی حکومتوں کا قیام قرار دیا جائے گا۔ یہ بات ایک سادہ سی مثال سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ خلافت راشدہ کے دوران جتنے ممالک بھی مسخّر و مفتوح ہوئے ان ممالک کی عظیم اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ جبکہ ہسپانیہ اور ہندوستان میں

مسلمانوں کی حکومت قریباً ساڑھے سات سو سال تک قائم رہی، لیکن ان کی عظیم اکثریت
غیر مسلم ہی رہی۔ جس کے نتیجے میں ہسپانیہ کے سقوط کے بعد آج وہاں مسلمانوں کا نام و نشان
بھی نہیں ملتا۔ اسی طرح ہندوستان میں آزادی اور تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں کی آبادی کا تناسب صرف
پچیس فیصد تھا۔ یہ مقامی لوگ بھی اکثر و بیشتر اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کی دعوت و تبلیغ سے
مسلمان ہوئے تھے۔ حکومت نے اس کام سے نہ صرف غفلت برتی بلکہ جو لوگ مسلمان ہو گئے
ان کی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی معقول [illegible] انتظام نہیں کیا۔ ان غلطیوں کا خمیازہ ہے
[illegible] میں رہ جانے والی مسلم اقلیت بھگت رہی ہے۔

اسلام کا عالمی غلبہ

[illegible] جو چودہ سو سال بیت چکے ہیں اس عرصہ میں امت مسلمہ عروج و زوال کے مختلف ادوار
سے گزری ہے[1] بہر حال خلافت راشدہ کے بعد اب تک جو عرصہ گزرا ہے اسے وقتی
[illegible] تعطل کا مرحلہ کہیں گے۔ ہماری تقویم کے اعتبار سے اگرچہ یہ چودہ پندرہ سو سال
[illegible] عرصہ نظر آتا ہے لیکن اللہ کے اپنے حساب کے مطابق اس عرصہ کی کوئی حیثیت ہی
[illegible] ہیں۔ وہاں تو ایک دن ہزار برس کا ہوتا ہے[2] بہرکیف قرآن حکیم
اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ہمارا ایمان ہے کہ بالآخر وہ وقت آ کر رہے گا جب
اسلام کا عالمی سطح پر غلبہ ہو گا انشاء اللہ العزیز۔ حق و باطل کی یہ کشمکش اور کشاکش فیصلہ کن
درجہ تک پہنچے گی اور پورا کرہ ارضی نور توحید سے جگمگا اٹھے گا۔ اور کلمة الله هي
العليا کی شان کا پورے طور پر ظہور ہو گا۔

آیت نمبر ۴ کے بقیہ حصے کا مطالعہ

ان تمہیدی باتوں کے بعد ہم اب آیت نمبر ۴ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ اس کا پہلا
حصہ ہم پچھلی نشست میں قدرے تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ تاہم ربط مضمون کے لئے چند

---

[1] اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ کا ایک نہایت اہم، مدلل اور فکر انگیز مقالہ "سرافگندیم" نامی کتاب میں شامل ہے۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید مطلب ہو گا (ادارہ)

[2] وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (الحج : ۴۷)

باتوں کا اعادہ ضروری ہوگا۔ فرمایا فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ
"پس جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو (تمہارا پہلا کام ہے) خوب ان کی گردنیں مارنا' اس طرح مارنا جیسے مارنے کا حق ہے"۔ میں نے ترجمانی میں مڈبھیڑ ہو ہی جائے اس لئے کہا کہ اس سے پہلے باقاعدہ مسلح تصادم کا ایک جنگ کی صورت میں موقع نہیں آیا تھا۔ یہ موقع پہلی بار غزوہ بدر میں پیش آنے والا ہے۔ فَضَرْبَ الرِّقَابِ میں ضرب کے 'با' پر جو زبر ہے وہ مفعول مطلق کا فائدہ دے رہا ہے' اس سے قبل محذوف مانا جائے گا فَاضْرِبُوهُمْ ضَرْبَ الرِّقَابِ ماروان کو گردنوں کو مارنا۔ یہ قرآن مجید کی بلاغت و فصاحت کا اعجاز ہے کہ صرف ایک خاص اسلوب کے استعمال سے یہاں معانی و مفاہیم میں وسعت پیدا کر دی۔ پچھلی مرتبہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں۔ یہ الفاظ بہت ہی سخت ہیں اور بڑا تیکھا انداز ہے لیکن یہ بات جان لیجئے کہ حق و باطل کی کشمکش میں اگر کوئی خاص فیصلہ کن مرحلہ آ جائے تو یہی انداز اس صورت حال کے عین مطابق ہے۔ جس سے اہل ایمان کو سابقہ پیش آئے گا۔ اس اسلوب میں ایک عجیب شان اور کیفیت جھلک رہی ہے جس سے صحیح لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جو عربی ادب کے فہم کا ذوق رکھتے ہیں۔

اثخان

اب آگے چلئے فرمایا۔ حَتَّى إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ
یہاں تک کہ جب تم ان کی اچھی طرح خونریزی کر چکو پوری طرح کچل چکو' چور چور کر دو تب قیدیوں کو بڑی مضبوطی سے باندھو"۔ پچھلی مرتبہ میں نے نوٹ کرایا تھا کہ اثخان کا لفظ پورے قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے' ایک یہاں اور ایک سورہ الانفال میں۔ اثخان کا مفہوم و معنی بھی میں پچھلی دفعہ قدرے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اور یہاں ترجمہ میں بھی اس کے مطلب کی ادائیگی کو میں نے ملحوظ رکھا ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا صحیح و جامع مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس طرح کچل دینا کہ اس میں مقابلہ کے لئے دوبارہ کھڑے ہونے کی سکت ہی نہ رہے گویا سانپ کا پھن اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ اپنا سر پھر نہ اٹھا سکے۔

شدِ وثاق

پچھلے درس میں اس کی تشریح و توضیح بھی ہو چکی ہے اس میں اضافہ کر لیجئے کہ شدّ کے معنی جہاں زور اور مضبوطی کے آتے ہیں' وہاں باندھنے کے بھی آتے ہیں چنانچہ عرب میں جب

سفر پر جانے کے لئے سازو سامان باندھا جاتا ہے تو اسے شد الرحال کہتے ہیں۔ رحیلہ سفر کو کہا جاتا ہے تو انسان جب سفر کے لئے اپنی گٹھڑی باندھتا ہے تو یہ شد الرحال ہے۔ شد الرحال کا لفظ اس حدیث میں بھی آیا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ کسی جگہ کی زیارت تبرکاً کرنا اور ثواب کی نیت سے کسی جگہ کا سفر کرنا صرف تین جگہوں کے لئے جائز ہے۔ پہلی مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف دوسری ...... میری مسجد...... اور تیسری مسجد اقصیٰ۔ دنیا میں صرف ان تین مسجدوں کی زیارت کی نیت سے ایک مسلمان سفر کے لئے سامان باندھ سکتا ہے باقی رہے دوسرے مقامات! سفر کی ممانعت نہیں ہے۔ تجارت، سیرو سیاحت اور دوسرے دینوی کاموں کے لئے سفر کئے جا سکتے ہیں لیکن ان تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کو متبرک سمجھتے ہوئے اور اس کی زیارت کے لئے اور ثواب کی نیت سے وہاں کا سفر اس حدیث کی رُو سے درست نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ جس پر ان کو چند نافہم لوگوں کے احتجاج پر قید کیا گیا اور اسی قید کی حالت میں وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

احسان اور فدیہ کا اصل محل

آگے چلئے فرمایا۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا میں نے جہاں تک غور کیا ہے تو میرے نزدیک آیت کے اس ٹکڑے میں تقدیم و تاخیر کا عمل ہوا ہے اور قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ شاعری کا اسلوب عام نثر سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ پھر اصناف سخن میں قریباً نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ آزاد شاعری (BLANK VERSE) روشناس ہوئی ہے، جس میں قوافی و ردیف کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن اس میں غنائیت (RYTHM) موجود ہوتی ہے۔ اسی کو جدید شاعری بھی کہا جاتا ہے...... عرصہ ہوا کہ میں نے قرآن مجید کے اسلوب کے متعلق عرض کیا تھا کہ اس کا اسٹائل قطعی طور پر نہ عام نثر ہے اور نہ شاعری۔ بلکہ اس کے اسلوب کو ہم خطبہ کا اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ گویا قرآن مجید خطبات الٰہی کا مجموعہ ہے۔ پھر اس کا اسلوب بڑی حد تک " BLANK VERSE " سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس آزاد شاعری میں غنائیت موجود ہوتی ہے لیکن اس میں عام طور پر فاعل، فعل، مفعول، خبر اور مبتدا وغیرہ میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے۔ میں نے بلا تشبیہہ عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں تقدیم و

تاخیر کا عمل ہوا ہے اس کا سبب قرآن مجید کا اپنا غنا ہے' اس کا جو ردم (RYTHM) ہے' اوراس کی جو ملکوتی موسیقی ہے۔ میری رائے میں اس غنائیت کی رعایت کی وجہ سے بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کا عمل ہوا ہے۔ اور یہاں بھی ہوا ہے۔ اصل میں جو بات سمجھائی گئی ہے اس کی ترتیب یہ ہے کہ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاۗءً یعنی پہلے توان کافروں کی خوب گردنیں مارواوراس وقت تک مارو جب تک ان کی طاقت کچلی نہیں جاتی۔ پھر ان کو مضبوطی سے باندھو' ان کو اسیر بناؤ...... اور یہ باندھنے کا عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک جنگ اپنے ہتھیار نہیں ڈال دیتی۔ یعنی فیصلہ کن حد تک مسلمانوں کے حق میں ختم نہیں ہو جاتی۔ WAR اور BATTLE کا فرق میں پچھلی تقریر میں اپنی امکانی حد تک خوب واضح کر چکا ہوں جنگ (WAR) ایک طویل عمل ہے جو کئی برسوں پر محیط ہو سکتا ہے۔ جبکہ BATTLE یا معرکہ کسی وقتی جھڑپ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ باقاعدہ جنگ (WAR) کا آغاز تو غزوہ بدر سے ہوا لیکن غزوہ بدر پر جنگ ختم نہیں ہو گئی بلکہ معرکہ بدر ختم ہو گیا جنگ تو ابھی جاری تھی۔ مشرکین عرب کے ساتھ جنگ کا خاتمہ تو فتح مکہ پر جا کر ہوا۔ تو فرمایا کہ جب تک اس جنگ (WAR) کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے اور ان دشمنان اسلام میں طاقت نہ رہے' حوصلہ نہ رہے کہ وہ مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں یعنی جنگ اپنے ہتھیار رکھ نہ دے۔ تب تک انہیں مضبوطی سے باندھے رکھنا ہے۔ البتہ جب یہ شکل پیدا ہو جائے کہ اب جنگ کا معاملہ ختم ہوا۔ اہل ایمان کو فیصلہ کن فتح حاصل ہو چکی تو "اے مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاۗءً چاہو توان کو بطور احسان رہا کر دو اور چاہو تو فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔" یہ ہے تقدیم و تاخیر کا عمل جو اس آیت میں واقع ہوا ہے۔ اور یہ ہے اصل میں ترتیب جس کی عملی تفسیر و تشریح ہمیں سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ملتی ہے جو فتح مکہ کے بعد سامنے آتی ہے کہ حضورؐ نے تمام جباران قریش کو یہ فرمایا کہ آزاد کر دیا کہ "لا تثریب علیکم الیوم" اور "اذھبوا فانتم الطلقاء" یہ موقع و محل ہے جہاں حضورؐ نے اپنی شان رافت و رحیمی کا بھی مظاہرہ فرمایا اور قرآن مجید کے حکم فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ پر بھی عمل کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد غزوہ حنین واقع ہوا۔ اس معرکہ میں جو چھ ہزار افراد بطور اسیران جنگ مسلمانوں کی تحویل میں آئے تھے جن کو مجاہدین میں بطور غلام تقسیم

ہوناایک لحاظ سے طے شدہ امر تھا، حضورؐ کی حسن تدبیر سے دفعۃً وہ سب آزاد ہو گئے۔ لیکن یہ بات نوٹ کیجئے کہ اسیران حنین کو اس لئے رہا نہیں کیا گیا تھا کہ اب غلام بنانے کی حرمت کا حکم آ گیا تھا بلکہ یہاں سبب کچھ اور تھا۔ میں یہ تمام واقعات پچھلی تقریر میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

منکرین سنت کی کج فہمی

منکرین سنت و حدیث نے فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً کو جو ایک مستقل و دائمی قانون بنالیا کہ قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں جو قیدی ہاتھ آئیں، ان کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو بطور احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر رہا کر دو۔ ان کے سوا تیسرا راستہ اور کوئی نہیں۔ یہ ان کی نافہمی یا کج فہمی ہے۔ یہاں تو اصلاً تین چیزیں بتائی گئی ہیں۔ کفار پہلے تو مستحق ہیں "فضرب الرقاب" کے یعنی ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ یہ ان کی اصل سزا ہے، جس کے وہ مستحق ہو چکے ہیں دوسرا یہ کہ ان کو باندھو اور باندھنا بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ ہے۔ اس باندھنے کی بھی تین شکلیں ہیں جن کو میں پچھلی نشست میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اختصار کے ساتھ ان کو پھر بیان کر دیتا ہوں۔ باندھنے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ انہیں اسیری ہی میں رکھا جائے۔ حضورؐ نے کچھ لوگوں کو اسیری میں رکھا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ان کو اسلامی معاشرہ میں جذب (ABSORB) کرنے کیلئے مجاہدین میں بطور غلام تقسیم کر دیا جائے..... اس غلامی کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات دی ہیں اور ان کی آزادی کے لئے جو اخلاقی راہیں کھولی ہیں، وہ بھی سابقہ درس میں بیان ہو چکی ہیں۔ البتہ ایک صورت کا ذکر رہ گیا تھا کہ مکاتبت ہو جائے۔ یعنی غلام اور آقا میں معاہدہ ہو جائے کہ غلام اپنے طور پر محنت و مزدوری کر کے یا اگر اسے کوئی ہنر آتا ہے تو اس کے ذریعہ سے ایک مقررہ رقم آقا کو ادا کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ تمام لوگوں کو اسلامی حکومت کی اجتماعی غلامی میں لے لیا جائے۔ یہ اجتماعی غلامی کیا ہے! ان کو ذمی بنا لیا جائے۔ فرق یہ ہو گا کہ وہ حقوق میں مسلمانوں کے مساوی (EQUAL) نہیں ہوں گے بلکہ وہ اسلامی ریاست کے دوسرے درجہ کے شہری (SECOND RATE CITIZEN) ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے لئے "صاغر" کا لفظ آیا ہے۔ "حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ ○" اس پر سابقہ نشست میں مفصل

گفتگو ہو چکی ہے ..... یہ تین شکلیں ہیں "شدِ وثاق" اب جو لوگ سنت رسولؐ کو یکسر نظر انداز کر دیں' اس کی حجیت کے انکاری ہوں' جو تاریخ کو بھی پس پشت ڈال دیں تو ان کے متعلق ہلکی سے ہلکی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی کور چشم ہیں۔ ان کو نہ تاریخ کا علم ہے اور نہ فلسفۂ تاریخ کا کوئی شعور ہے ۔ البتہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ بحالات موجودہ غلامی کا کوئی ادارہ (INSTITUTION) موجود نہیں ہے۔ چونکہ یہ معاملہ تو خالص اسلامی جہاد اور قتال سے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہ کسی ملک کے لوگوں کو زبردستی پکڑ کر غلام بنا لیا جائے اور انہیں منڈیوں میں یا انفرادی طور پر بیچ دیا جائے۔ یہ بُردہ فروشی بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام اسے کسی شکل میں جائز نہیں ٹھہراتا۔ یہ کام ہر فقہی مسلک کے نزدیک اسلام میں حرام مطلق ہے۔ جیسا کہ میں پچھلی تقریر میں بتا چکا ہوں کہ اس دور میں یہ جرم اہل یورپ نے بڑے پیمانے پر کیا کہ افریقہ کے آزاد لوگوں کو پکڑ کر لوہے کی بھاری زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر امریکہ لے جاتے تھے اور انہیں اپنا غلام بنایا جاتا اور ان کی خرید و فروخت کی جس کے لئے ان کو حکومت اور قانون کی طرف سے پورا تحفظ حاصل تھا پس آزاد لوگوں کو پکڑ کر اس طرح غلام بنا لینا اسلام کے اعتبار سے بھی اور انسانیت کے اعتبار سے بھی نہایت گھناؤنا جرم ہے۔

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ دراصل یہ معاملے کے تین پہلو ہیں جو اس آیت کے پہلے حصہ میں بیان ہوئے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں سب کے لئے یہ مسئلے طے ہو جائیں۔ قریش کی حد تک فتح مکہ کے بعد ہی آخری درجہ میں بات پہنچ گئی تھی۔ دوسرے قبائل کے لئے بات دوسرے درجہ میں تھی اور باقی پوری دنیا کے لئے تو ابھی پہلا ہی درجہ تھا۔ ابھی ان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں چھیڑ چھاڑ ہی شروع ہوئی ہے ان کے ساتھ باقاعدہ جنگ (WAR) کا آغاز تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ پہلے خلیفہ راشد کے دور میں ہوا ہے..... پھر یہ سلسلہ جاری رہے گا تاقیامِ قیامت' جب تک پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "شُدُّوا الوِثَاق" کا حکم برقرار ہے' یہ ختم نہیں ہوا۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً نے اس کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ یہ اپنی جگہ قائم ہے' دائم ہے اور جب بھی خالصتاً غلبۂ دین کے لئے قتال ہو گا تو تینوں شکلوں میں سے کوئی بھی اختیار کی جا سکے گی۔ یہ ہے قرآن کا اصل اور ابدی قانون یہی وجہ ہے کہ ہمیں غلامی کے ادارہ (INSTITUTION) کے خاتمہ کی صراحتًہ نہ کنایتًا قرآن

مجید میں کوئی آیت نہیں ملتی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو کیا دیر لگتی تھی کہ جہاں چھ ہزار سے زائد آیات نازل فرمائیں وہاں ایک آیت یہ بھی نازل فرما دیتے کہ آج سے غلامی کا قانون ختم کیا جا رہا ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔ اہل ایمان میں سے کوئی چوں بھی نہ کرتا۔ نہ حضورؐ نے ہی غلامی کے ادارہ (INSTITUTION) کے خاتمہ کا اعلان فرمایا۔ بلکہ غزوہ حنین کے چھ ہزار اسیران جنگ جو مجاہدین میں تقسیم ہونے والے تھے، ہوازن اور ثقیف کے قبائل کی سفارت پر انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تدبیر بتائی اور پھر صحابہ کرامؓ کے مجمع میں اپنے خاندان کے حصہ کے قیدیوں کی آزادی کا اعلان فرما کر مجاہدین سے سفارش فرمائی کہ وہ بھی اپنے اپنے حصہ کے قیدیوں سے دستبردار ہو جائیں اور تمام مجاہدین خوشی خوشی دست بردار ہو گئے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم بھی دے سکتے تھے۔ لیکن چونکہ اللہ کا منشا، مدعا اور حکمت یہی تھی کہ غلامی کے ادارہ کو باقی رکھا جائے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حکم نہیں دیا بلکہ سفارش تک معاملہ رکھا۔ اور اس سفارش کے نتیجہ میں چھ ہزار قیدی آزاد ہو گئے۔ لہٰذا قرآن کا درحقیقت سمجھنا وہ سمجھنا ہے جو سنت اور سیرت مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اس سے آزاد ہو کر کوئی شخص قرآن فہمی کا دعویٰ کرتا ہے وہ خود بھی گمراہ ہے اور جو لوگ اس کی بات کو تسلیم کر لیں اندیشہ یہ ہے کہ وہ بھی اپنی راہ گم کر بیٹھیں گے اہل سنّت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ سنت رسولؐ اور احادیث صحیحہ سے جو شخص اپنے آپ کو آزاد کر کے قرآن پر غور و فکر اور تدبر کرے گا وہ ٹھوکریں کھائے گا اور ضلالت میں مبتلا ہو کر رہے گا۔

آیت مبارکہ کے بقیّہ حصّہ کا مطالعہ

اب آگے چلئے فرمایا ذٰلک، یہاں جو ذٰلک کا لفظ آیا ہے تو یہ ہے زور دینے کا انداز...... تاکید کی جا رہی ہے کہ یہ ہے اصل بات، یہ ہے تمہارے کرنے کا اصل کام۔ یعنی اس مقام سے سرسری طور پر نہ گزر جانا۔ اس کے ایک ایک لفظ پر ڈیرہ لگا کر بیٹھو۔

سنت الٰہی کی طرف اشارہ

آگے فرمایا۔ وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانْتَصَرَ مِنْھُمْ "اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان مشرکین و کفار سے نمٹ لیتا"...... اب رسولوں کے بارے میں اللہ کی جو سنت رہی ہے، اس کے ضمن میں بات آ رہی ہے۔ اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ جیسے ہمارا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے

کہ جن قوموں کی طرف رسول بھیجا اور رسول نے اتمام حُجت کر دیا۔ حق کو پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ پھر بھی قوم نے نہیں مانا تو قوم ہلاک کر دی گئی۔ اس ہلاکت کے طریقے پہلے کیا رہے! حضرت نوحؑ کی قوم پر ایک بہت عظیم سیلاب آیا پوری قوم غرق ہو گئی۔ حضرت ہود اور حضرت صالحؑ کی قوموں پر عذاب مختلف شکلوں میں آیا سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ) قوم عاد پر ایک تیز آندھی بھیجی گئی جو سات راتیں اور آٹھ دن ان پر مسلسل چلتی رہی۔ تصور کیجئے کہ تھوڑی دیر کے لئے تیز آندھی آتی ہے تو کیا درگوں حال ہو جاتا ہے اور اس آندھی میں توریت کے چھوٹے چھوٹے ذرّات ہوتے ہیں' اگر ذرا بڑے کنکر آرہے ہوں تو وہ گولی کا کام کرتے ہیں۔ اگر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل طوفانی آندھی آئے اور اس میں کنکر ہوں تو وہ کیا تباہی لائیں گے۔ اس طرح قوموں کو ہلاک کیا گیا کسی قوم پر زبردست زلزلہ آگیا کہیں بستیوں کو الٹ دیا گیا۔ عذاب کی یہ مختلف شکلیں رہی ہیں۔ لیکن یہ تمام عذاب آفات سماوی وارضی کے مظاہر کی صورت میں آتے رہے ہیں۔ یہ عذاب انسانوں کے ہاتھوں نہیں آئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان مشرکین و کفار قریش و عرب سے خود ہی براہ راست نمٹ لیتا ہے۔ اے مسلمانو! تمہیں یہ تکلیف نہ دیتا کہ ہاتھ میں تلوار اٹھاؤ اور میدان قتال میں آؤ...... اللہ تعالیٰ آن واحد میں ان مشرکین و کفار کو تہس نہس کر سکتا تھا' ان سے انتقام لے سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہلاکت کے مستحق ہو چکے تھے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اتمام حجت کر چکے ان پر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو چکا۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا! اس کی شرح آگے آ رہی ہے۔

اہل ایمان کی آزمائش و امتحان

اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین سے خود انتقام کیوں نہ لیا! اس لئے کہ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ لیکن یہ بھی اللہ کی حکمت ہے۔ تمہارے بارے میں اے اہل ایمان 'اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فیصلہ کر رکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم انسانوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمائے۔ تمہارے ایمان کا بھی امتحان ہو گا اگر اللہ تعالیٰ کسی سماوی یا ارضی آفت کے ذریعہ سے ان سب کو دفعتًہ ہلاک کر دیتا تو تمہارے صبر و مصابرت اور استقامت کا امتحان کیسے ہوتا! تمہاری تربیت کا ذریعہ کیا بنتا! تم جو قلیل تعداد اور اتنے کم ہتھیاروں کے